تذکرہ

حضرت مولانا حاجی معین الدین

استھانوی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

سابق پرنسپل مدرسہ اسلامیہ شمس الہدی پٹنہ وسابق رفیق دار المصنفین اعظم گڑھ

مرتب

طلحہ نعمت ندوی

تذکرہ

حضرت مولانا حاجی معین الدین

استھانوی ندوی علیہ الرحمۃ

مرتب

طلحہ نعمت ندوی

جملہ حقوق کتب مرتب محفوظ ہے

تفصیل کتب

کتاب کا نام	:	تذکرہ حاجی معین الدین استھانوی
مرتب	:	طلحہ نعمت ندوی
صفحات	:	۵۲
کمپوزنگ	:	ابوذر شیبان
قیمت	:	۳۰ روپیہ
سال اشاعت	:	۲۰۲۰
ناشر	:	

فہرست مضامین

مضامین	مضمون نگار	صفحہ
عرض مرتب	طلحہ نعمت ندوی	۴
آہ! حاجی معین الدین ندویؒ	علامہ سید سلیمان ندویؒ	۶
رفیق عزیز حاجی معین الدین صاحب ندویؒ	مولانا اکرام اللہ خاں ندوی	۸
آہ! حاجی صاحب	مولانا ریاست علی ندویؒ	۲۳
مولانا حاجی معین الدین ندوی کی رحلت	مولانا عبدالسلام قدوائی ندویؒ	۲۵
علامہ معین الدین ندوی گیلانوی	عطاء اللہ پالوی	۲۶
دارالمصنفین کے اولین رفیق مولانا حاجی معین الدین ندوی	طلحہ نعمت ندوی	۳۲

عرض مرتب

زیر نظر کتابچہ ایک ممتاز عالم ومصنف حضرت مولانا حاجی معین الدین ندوی استھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات زندگی پر مختلف شخصیات کی تحریروں کا مجموعہ ہے، حاجی صاحب کی شخصیت مختلف کمالات واوصاف کی حامل تھی، وہ ایک کامیاب مصنف بھی تھے اور مدرس بھی، باشعور عالم بھی اور کہنہ مشق ادیب بھی، اور اخلاقی بلندی، تقوی وطہارت اور ذاتی اوصاف اس پر مستزاد۔ انہوں نے عربی اردو اور انگریزی تینوں زبانوں میں مختلف علمی یادگاریں چھوڑی ہیں، اور بعض نامور تلامذہ بھی۔

لیکن حیرت ہے کہ حاجی صاحب ان متنوع کمالات کے باوجود کسی اسکالر کی تحقیق کا موضوع نہیں بن سکے، اس کمی کا جب احساس ہوا تو خیال آیا کہ اگر مفصل نہ ہو سکے تو مختصرا ہی سہی ان پر کچھ لکھا جائے اور آئندہ تحقیق کرنے والوں کے لئے ان پر تحریر کردہ اصل مواد یکجا کر دیا جائے تا کہ ان کی زندگی کا کچھ خاکہ بھی سامنے آسکے اور اس کا مطالعہ کسی کے لئے مزید کام یا اس موضوع پر تحقیق کا محرک بھی بن سکے، چنانچہ پہلے ان کے حالات پر ایک مفصل مضمون لکھا گیا جس میں ان کی سوانح زندگی کی مختلف ومنتشر کڑیوں کو مرتب کر کے پیش کیا گیا، یہ مقالہ معارف میں شائع ہوا اور پسند کیا گیا۔ اس کے بعد ان پر لکھی ہوئی جو

تحریریں علم میں آسکیں جن میں براہ راست اطلاعات (فرسٹ انفارمیشن) شامل ہیں یکجا کر کے اہل علم کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔

امید ہے کہ اہل علم فائدہ اٹھائیں گے، اور حاجی صاحب کی علمی شخصیت پر کام کرنے والوں کے لئے یہ رسالہ محرک ثابت ہوگا۔

طلحہ نعمت ندوی

استھاواں، بہار شریف، نالندہ

آہ! حاجی معین الدین ندویؒ

(مصنف خلفائے راشدین)

☆ حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ ☆

افسوس کہ پانچ ربیع الثانی ۱۳۶۰ھ کو ہمارہی جماعت کے ایک لائق فرد مولانا حاجی معین الدین صاحب ندوی صدر مدرس مدرسہ اسلامیہ شمس الہدی پٹنہ نے تقریباً پچاس برس کی عمر میں وفات پائی۔انہوں نے اپنی پوری تعلیم دارلعلوم ندوۃ العلماء میں حاصل کی اور ۱۹۱۲ء میں درجہ تکمیل سے فراغت پائی،۱۹۱۴ء کے آخر میں دارالمصنفین کے قیام پر وہ دارالمصنفین کے رفیق منتخب ہوئے اور سلسلہ سیر الصحابہ کی پہلی اور دوسری جلد خلفائے راشدین اور مہاجرین حصہ اول لکھی،ایک سال کے بعد یہاں سے کتب خانہ ندوہ کی ترتیب کے لئے لکھنؤ گئے،اس کام سے ان کو ایسی دلچسپی ہوئی کہ بوہارا امپیریل لائبریری کلکتہ میں ترتیب فہرست کے کام پر لگائے گئے اور کئی جلدیں بڑی قابلیت سے انگریزی میں مرتب کیں، اور گورنمنٹ کی طرف سے چھپیں۔اس جگہ کی تخفیف ہونے پر دائرۃ المعارف حیدرآباد میں قدیم ہندوستانی تاریخی مقامات کا ایک جغرافیہ عربی زبان میں ترتیب دیا جو دائرہ کی طرف سے چھپا ہے، یہاں سے نکل کر وہ چندروز رام پور کی سرکاری لائبریری میں

مقرر ہوئے اور آخر صوبہ بہار کی مشہور سرکاری درس گاہ مدرسہ شمس الہدیٰ کے پرنسپل مقرر ہوئے اور اسی خدمت پر وفات پائی۔

وہ نہایت خاموش طبیعت ،ملنسار،متواضع اور نیک دل تھے،وطن صوبہ بہار کے دو مشہور گاؤں گیلانی اور استھانواں میں تھا،نوجوانی ہی میں جب وہ دارلعلوم میں پڑھتے تھے حج سے مشرف ہوئے تھے،اسی لیے وہ ہماری جماعت میں حاجی صاحب کے نام سے ایسے مشہور ومعروف تھے کہ یہ ان کے اصلی نام کا جزو بن گیا تھا،انگریزی تعلیم صرف ندوہ میں چند ریڈروں تک پڑھی مگر کام کرنے پر اپنی ذاتی محنت سے اتنی ترقی کی کہ انگریزی میں فہرست دو تین جلدیں ایسی لکھیں کہ اہل بصیرت نے بھی ان کی تعریف کی ۔آخر زمانہ میں وہ کتب حدیث کا درس دیتے تھے اور یہی ان کا آخری کارنامہ ہے،اللہ تعالی اس مجموعہ فضل وکمال و اخلاق کو اپنی عطا ومغفرت سے سرفراز اور اس کی خدمتوں کو قبول فرمائے۔

(ماہنامہ معارف ربیع الثانی ۱۳۶۰ھ،مئی ۱۹۴۱ء۔ویادرفتگاں)

رفیق عزیز حاجی معین الدین صاحب ندویؒ

☆مولانا اکرام اللہ خاں صاحب ندویؒ☆

''موت'' کا کوئی وقت معین نہیں، اس لیے جس وقت بھی وہ واقع ہو کوئی عجیب وغیر معمولی بات نہیں، بلکہ بایں ہمہ جب بعض دفعہ ہم اچانک اپنے کسی عزیز یا دوست کی خبر وفات سنتے ہیں تو یہ غیر متوقع چیز معلوم ہوتی ہے، چنانچہ مولوی حاجی معین الدین صاحب ندوی کی رحلت بھی ہماری جماعت کے لیے ایک خلاف توقع واقعہ ہے جو اچانک پیش آیا، کیوں کہ ہم میں سے کوئی بھی یہ نہ سمجھتا تھا کہ (مرحوم) حاجی صاحب ہم سے اس قدر جلد جدا ہو جائیں گے۔

ابھی کل کی بات ہے کہ حاجی صاحب دارالعلوم ندوۃ العلماء میں پڑھتے تھے، ان کا عنفوان شباب تھا، اور صحت نہایت اچھی، بے فکری تھی اور آزادی، دنیا کے جھگڑوں سے کوئی سروکار نہ تھا، ندوہ سے نکل کر عملی دنیا میں قدم رکھا۔ یہ گویا ان کی زندگی کا دوسرا دور تھا، جو تالیف وتصنیف اور تدریس میں گزرا، اور اسی طرح گزر رہا تھا کہ پیام اجل آیا، اور وہ دفعتاً ہم سے جدا ہو گئے۔ مرحوم کی زندگی کا ''آغاز وانجام'' پیش نظر ہے، اس لیے یہ سارا واقعہ ایک کھیل معلوم ہوتا ہے اور کھیل بھی ایسا جس کے سارے مدارج جلد جلد ہماری آنکھوں

کے سامنے سے گزر گئے اور پھر وہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔

جب میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں بحیثیت طالب علم داخل ہوا تو پہلے ہی روز حاجی صاحب مرحوم اور مولوی (اب حاجی) مسعود علی صاحب ندوی نیز دو تین اور طلبہ سے ملاقات ہوئی، جو زمانۂ مابعد میں بہترین رفیق اور شریف دوست ثابت ہوئے، یہ سب میرے ہم سبق تھے، لیکن حاجی صاحب مرحوم کے ساتھ یہ مزید خصوصیت تھی کہ ہم دونوں ایک ساتھ رہتے تھے، گویا پڑھنا لکھنا، رہنا سہنا، کھانا پینا، سیر و تفریح، یعنی شبانہ روز کی پوری زندگی ایک ساتھ گزرتی تھی، کئی سال اسی طرح گذر گئے۔

ایک شریف طالب علم کی زندگی عموماً ایک کھلی ہوئی کتاب کی طرح سب کے سامنے ہوتی ہے۔ وہ تصنع، ریاکاری اور زمانہ سازی سے عموماً بالاتر ہوتا ہے، البتہ جب وہ عملی دنیا میں قدم رکھتا ہے تو ماحول کے اثر اور دوسرے لوگوں کی صحبت سے اس میں اس قسم کی کمزوریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ حاجی صاحب بھی اپنی طالب علمانہ زندگی میں بناوٹ اور ریاکاری سے بہ مراحل دور تھے البتہ طبیعت کسی قدر دیر آشنا تھی، اس لیے ہر کس و ناکس سے جلد مانوس نہیں ہوتے تھے، لیکن جب مناسبت طبعی اور اتحاد ذوق کی بنا پر کسی سے مانوس ہو جاتے تو پھر اس پر پورا اعتماد کرتے اور اخلاص و بے تکلفی سے ملتے تھے، ایک دفعہ اعتماد کر لینے کے بعد پھر ان کے دل میں اپنے احباب کی طرف سے بدگمانی نہیں پیدا ہوتی تھی۔

حاجی صاحب طالب علمی کے زمانہ میں بلند نظر و باوقار تھے، عادات و اطوار میں شائستگی اور خودداری تھی اور عزت نفس کا پاس، اس لیے کوئی مبتذل اور گھٹیا حرکت ان سے

کبھی سرزد نہیں ہوتی تھی اور وہ ہمیشہ عامیانہ وسوقیانہ صحبتوں سے بچتے تھے۔ البتہ اپنے مخصوص احباب کے حلقے میں وہ بے تکلف اور خوش مزاج نظر آتے تھے، حفظ مراتب کا انہیں خاص خیال رہتا تھا۔ اس لیے وہ اپنے سے کم عمر اور چھوٹی جماعتوں کے طلبہ کو کبھی اس کا موقع نہیں دیتے تھے کہ وہ ان سے مساویانہ بے تکلفی کے ساتھ بات چیت کریں، اسی طرح وہ اپنے اساتذہ اور بزرگوں کا پورا احترام کرتے اور ان کے ساتھ تہذیب وشائستگی سے پیش آتے تھے۔ لیکن اس میں بھی اعتدال پیش نظر تھا، کسی بلند شخصیت کے سامنے جھکنا یا اس کی ہاں میں ہاں ملانا ان کی عادت نہ تھی، وہ طبعاً آزاد خیال تھے اور بے نیازی کی شان ان کے ہر انداز سے نمایاں تھی۔

حاجی صاحب کی ایک خاص شرافت یہ تھی کہ وہ لوگوں کے عیوب اور اخلاقی کمزوریوں کی پردہ پوشی کرتے اور خلوت یا جلوت میں ان باتوں کا تذکرہ کر کے کسی کو رسوا کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اگر کسی صحبت میں اس قسم کے تذکرے چھڑ جاتے تو وہ حتی الامکان موضوع گفتگو بدل کر لوگوں کو کسی اور طرف متوجہ کر دیتے تھے۔

حاجی صاحب کی زندگی نہایت سادہ اور معتدل تھی وہ کبھی اپنی حیثیت سے زیادہ نہیں خرچ کرتے تھے اور بظاہر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ انہیں کسی خاص چیز کا شوق نہیں ہے، جس پر وہ بلا لحاظ عواقب روپیہ خرچ کریں، اگر کسی موقع پر ان کے پاس روپیہ نہ رہتا اور مکان سے آنے میں دیر ہوتی تو وہ اپنا ذاتی خرچ بھی بند کر دیتے اور کسی سے قرض لے کر اپنی ضرورت پوری نہیں کرتے تھے۔ مجھے یاد نہیں کہ انہوں نے کسی ضرورت کے لیے کبھی کسی

سے قرض لیا ہو، وہ ہمیشہ ہر چیز نقد خریدتے اور دارالاقامہ کی فیس بوقت ادا کرتے، اس عادت کی بنا پر کبھی کسی کا کوئی مطالبہ ان کے ذمہ نہیں رہا۔ اسی طرح وہ سب معاملات میں صفائی کا لحاظ رکھتے تھے، دیانت اور ذمہ داری کا احساس ان کی خصوصیت تھی۔

حاجی صاحب ایک ذہین وذی استعداد طالب علم تھے، ان کی قوت مطالعہ اچھی تھی اور دماغ سلجھا ہوا، اس لیے وہ عموماً ہر چیز کو صحیح طور پر سمجھتے تھے، ایسا شاذ و نادر ہوتا تھا کہ اُن کا دماغ کجی کی طرف مائل ہو۔ وہ عام طلبا کی طرح کسی کتاب ومضامین کا طوطے کی طرح رٹنا اور بار بار یاد کرنا پسند نہیں کرتے تھے بلکہ جب کسی مسئلہ کو سمجھنا اور ذہن نشین کرنا چاہتے تو کتاب لے کر ایک طرف بیٹھ جاتے اور کامل توجہ اور پوری انہماک ویکسوئی کے ساتھ مطالعہ میں مستغرق ہوجاتے یہاں تک کہ اس مسئلہ کو بخوبی سمجھ کر محفوظ کر لیتے، اور جب انہیں یقین ہوجاتا کہ مسئلہ ذہن نشین ہوگیا تو پھر فوراً کتاب بند کر کے دوسرے کاموں میں اس طرح مصروف ہوجاتے کہ گویا انہیں کتاب سے دور کا بھی تعلق نہیں۔

جہاں تک عام حالت کا تعلق ہے حاجی صاحب روزمرہ زیادہ محنت نہیں کرتے تھے۔ بس مقررہ کام انجام دیتے اور پوری نیند سوتے۔ لیکن جب واقعی طور پر محسوس کرتے کہ اب کام کرنے کا وقت آ گیا تو دفعتاً اُن کی زندگی میں ایک انقلاب پیدا ہوجاتا اور وہ یکسر کام میں مصروف ہوجاتے اور بڑی مستعدی سے امتحان کے لیے تیاری کرتے اور کامیاب ہوتے۔

نماز عصر کے بعد وہ درسی سلسلہ کا کام بالکل بند کر دیتے اور یہ وقت عموماً ''اخبار

بینی‘‘ میں صرف کرتے تھے، وہ اخبار پوری توجہ سے پڑھتے اور زیر بحث مسائل کو سمجھنے کی کوشش کرتے، وہ ہر مسئلہ کے متعلق اپنی مستقل رائے رکھتے تھے، کورانہ تقلید سے بالاتر تھے۔

اُس زمانہ میں دارالعلوم ندوہ میں اردو عربی کے بہت سے اخبارات آتے تھے، جو طلبہ کے ’’دارالمطالعہ‘‘ میں (جس کا نام ’’دارالمعلومات‘‘ تھا) میزوں پر رکھ دیے جاتے تھے۔ دارالمعلومات کا انتظام طلبہ کے ہاتھ میں تھا، ایک زمانہ میں حاجی صاحب بھی اُس کے ناظم تھے، وہ اخبارات فراہم کرنے کا خاص اہتمام کرتے تھے۔ علامہ شبلی نعمانی مرحوم اس زمانہ میں دارالعلوم کی پرانی عمارت کے احاطہ میں بالائی منزل پر رہتے تھے، مولانا مرحوم کے پاس بہت سے اخبارات آتے تھے، لیکن مولانا کو اس طومار کو پڑھنے کی کہاں فرصت تھی، وہ ان اخبارات پر ایک سرسری نظر ڈال کر میز کے نیچے پھینک دیتے، حاجی صاحب شام کو یہ اخبارات اُٹھالاتے، اکثر ایسا بھی ہوتا کہ مولانا مرحوم ان اخباروں کو کمرہ کے ایک دروازہ سے (جہاں ان کے لکھنے پڑھنے کی میز تھی) باہر پھینک دیتے۔ کمرہ کے نیچے ایک دوسرے کمرہ کا چھپر تھا۔ یہ اخبار اس پر آکر گرتے، حاجی صاحب یہ کرتے کہ ایک لانبا بانس لے کر اس کے سہارے سے یہ اخبار چھپر سے اُتار لیتے اور دارالمعلومات میں لاکر رکھتے۔

اس زمانے میں امین آباد پارک میں ایک مسلم کلب بھی تھا، جہاں اُردو انگریزی کے بہت سے اخبارات آتے تھے، ہم لوگ نماز عصر کے بعد عموماً وہاں جایا کرتے تھے، لیکن جب علامہ شبلی نعمانیؒ لکھنؤ میں تشریف ہوتے تو شام کو ہماری حاضری عموماً علامہ کے یہاں ہوتی۔ یہ عجیب صحبت تھی، یہاں سے ہم عموماً معلومات کا ایک بیش بہا خزانہ لے کر اُٹھتے،

مولانا بھی ہم لوگوں کو عزیز رکھتے اور تقریباً ہر حاضری کے موقع پر کسی نہ کسی معاملہ میں ہماری رہنمائی فرماتے تھے۔ جس روز اس صحبت میں کوئی خاص علمی یا تاریخی نکتہ ہمیں معلوم ہوتا تو ایک بے پایاں مسرت وخوشی حاصل ہوتی تھی، اب یہ مسرت کہاں میسر آسکتی ہے، بس ایک خواب تھا جو کبھی دیکھا تھا۔

اس زمانہ میں ہمارے احباب ورفقا ہیں ایک اور دلچسپ ہستی تھی، جسے ہم سب خواجہ صاحب کہتے تھے، لیکن آخر میں ان کا ایک اور بہت دلچسپ نام مشہور ہوگیا تھا جس کا یہاں ظاہر کرنا مناسب نہیں ورنہ خواجہ صاحب جو طالب علمی کے زمانہ میں بھی اس نام سے ناخوش ہوتے تھے اب اور زیادہ ناخوش ہوں گے۔ بہرحال خواجہ صاحب بھی ہم لوگوں کے ساتھ شام کو علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ ان کے خاص انداز واطوار، طبیعت کی جلد بازی اور کثرت استفسارات کی وجہ سے علامہ کو بھی ان سے دلچسپی پیدا ہوگئی تھی اور وہ خواجہ صاحب کی حرکتوں پر اکثر ہنس دیا کرتے تھے۔

خواجہ صاحب کی عادت تھی کہ وہ علامہ کا ایک ایک لفظ غور سے سنتے اور جب کوئی ایسا لفظ سنتے جس سے ان کے کان پہلے سے آشنا نہیں یا اس کا محل استعمال معلوم نہیں تو وہ اسی صحبت میں آہستہ آہستہ لیکن بار بار اس لفظ کا اعادہ کرتے تاکہ بھول نہ جائیں۔ اکثر دیکھنے میں آیا کہ ادھر علامہ کی زبان سے کوئی نیا لفظ نکلا اور ادھر خواجہ صاحب کے ہونٹ آہستہ آہستہ حرکت کرنے لگے، وہاں سے اُٹھ کر خواجہ صاحب روزمرہ کی بات چیت میں کوئی نہ کوئی موقع نکال کر یہ نئے الفاظ ضرور استعمال کرتے تھے، حاجی صاحب بلکہ ہماری ساری جماعت کو

خواجہ صاحب سے خاص دلچسپی تھی، اب وہ ایک کالج میں پروفیسر ہیں اور ایک متین وسنجیدہ بزرگ سمجھے جاتے تھے۔

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ خواجہ صاحب طلبائے دارالعلوم کی ایک انجمن کے ناظم (سکریٹری) منتخب ہوگئے، حاجی صاحب نے یہ سن کر رنگ برنگ کاغذوں کا ایک اونچا تاج بنایا اور اسے پھولوں سے خوب سجایا اور وہ ایک جگہ محفوظ کر دیا، انتخاب کے بعد طلبہ ہال میں جمع ہوئے اور انجمن کا پہلا جلسہ منعقد ہوا، اس کے بعد خواجہ صاحب شکریہ کی تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو حاجی صاحب نے پشت کے دروزاے سے نمودار ہوکر تاج ان کے سر پر رکھ دیا جس سے خواجہ صاحب کی صورت عجیب مضحکہ انگیز بن گئی، انہوں نے پیچھے پلٹ کر دیکھا اور نہایت سنجیدہ انداز اختیار کرلیا، مجمع میں ہر طرف سے قہقہہ بلند ہوا، مگر خواجہ صاحب نے اپنے اسی سنجیدہ انداز میں ایک تقریر کرتے ہوئے اس ''تاج بخشی'' پر حاجی صاحب اور طلبائے دارالعلوم کا شکریہ ادا کیا، تقریر کے دوران میں تاج بدستور سر پر رہا، یہ انداز دیکھ کر سارا جلسہ سنجیدہ بن گیا اور خواجہ صاحب اپنی تدبیر میں کامیاب ہوئے۔

اسی طرح کے اور بہت سے دلچسپ واقعات حاجی صاحب کے زمانۂ طالب علمی کے ہیں، جو بخوف طوالت نظر انداز کیے جاتے ہیں۔ یہ چند واقعات بھی اس لیے عرض کیے گئے کہ ایک ندوی بھائی اور مرحوم دوست کی طالب علمانہ زندگی کی ایک جھلک ہمارے بھائیوں کے سامنے آجائے۔ اگر حاجی صاحب ابھی ہم سے رخصت نہ ہوتے تو کسی نہ کسی حیثیت سے بار بار ان کا ذکر آتا اور شاید وہ خود بھی کبھی الندوہ میں کچھ لکھتے اور طلبائے قدیم

کے جلسوں میں شریک ہوتے، اب یہ صورت ممکن نہیں اس لیے بے اختیار دل چاہا کہ رفیق دیرینہ کے متعلق چند الفاظ لکھ دیے جائیں تو بطور یادگار باقی رہیں، اب کون بار باران کا ذکر کرے گا، البتہ ان کی تصانیف ایک زندہ یادگار ہیں جو مدت تک باقی رہیں گی۔

جب میں اور حاجی معین صاحب دارالعلوم ندوہ میں اپنی تعلیم ختم کر کے فارغ ہوے تو ندوہ ایک دور انقلاب سے گزر رہا تھا، تعلیمی وانتظامی حالت میں تبدیلیاں ہورہی تھیں اور ارکان ندوۃ العلماء کی باہمی کشمکش اور اختلافات سے شکستہ خاطر ہوکر علامہ شبلی نعمانیؒ اپنے عہدۂ معتمدی سے دستکش ہو چکے تھے اور مستقل قیام کے ارادہ سے اپنے وطن اعظم گڑھ تشریف لے گئے تھے، جہاں آپ دارالمصنفین قائم کرنے کے لیے جدوجہد میں مصروف تھے۔ علامہ نے دارالمصنفین کا ایک خاکہ مرتب کیا تھا اور یہ طے کرلیا تھا کہ اپنا بنگلہ اور باغ اس کام کے لیے وقف فرمادیں گے۔ دارالمصنفین کے لیے علامہ کو ایسے صحیح المذاق وجید الاستعداد نوجوانوں کی ضرورت تھی جو فی الجملہ تصنیف کا سلیقہ رکھتے ہوں اور ان کے زیر تربیت رہ کر تالیف وتصنیف کی خدمت انجام دے سکیں۔ گویا مختصر الفاظ میں دارالمصنفین کا مقصد یہ تھا کہ بہترین مصنف پیدا کیے جائیں جو موجودہ زمانہ کے حالات کے مطابق تالیف وتصنیف کا کام کرسکیں۔

یہ ظاہر ہے کہ اس قسم کے نوجوان انہیں صرف دارالعلوم ندوہ ہی سے مل سکتے تھے جنہوں نے سالہا سال تک علامہ کے زیر نگرانی تعلیم حاصل کی تھی اور برسوں تک ان کی صحبت سے متمتع ہو چکے تھے، اس کے علاوہ ایک حد تک تالیف وتصنیف کے مبادی سے بھی آشنا

تھے۔اسی بنا پر علامہ نے ہم میں سے چند طلبہ کو جو تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے اور زمانۂ طالب علمی میں اُن کے حلقہ نشین تھے اس کام کے لیے منتخب کر کے اعظم گڑھ طلب کیا تھا، لیکن ابھی اس سلسلہ میں مراسلت ہو رہی تھی کہ علامہ نے رحلت فرمائی۔

اس زمانہ میں حاجی صاحب عارضی طور پر وطن جا چکے تھے اور میں لکھنؤ میں تھا اور رسالہ الندوہ کی ایڈیٹری کے فرائض ادا کر رہا تھا، یہ علمی و تاریخی رسالہ جو ندوۃ العلماء کا آرگن تھا کچھ مدت پہلے بند ہو چکا تھا اور علامہ شبلی نعمانی جو رسالہ کے ایڈیٹر تھے، اس کام سے دستکش ہو گئے تھے۔

غرض دارالعلوم ندوہ سے فارغ ہونے کے بعد میرا قیام تو رسالۂ الندوہ کے کام کی وجہ سے لکھنؤ میں رہا لیکن حاجی معین الدین صاحب چند روز بعد اعظم گڑھ چلے گئے۔مولوی مسعود علی صاحب ندوی پہلے ہی (علامہ کی رحلت کے بعد) اعظم گڑھ جا چکے تھے۔مولانا سید سلیمان صاحب ندوی بھی پونا سے اپنے پروفیسر کے عہدہ سے مستعفی ہو کر اعظم گڑھ چلے آئے تاکہ بحیثیت جانشین علامہ مرحوم دارالمصنفین کی تاسیس و ترقی اور سیرت نبوی ﷺ کی تکمیل کے لیے کوشش کریں۔

علامہ کے ان سب مخلص تلامذہ نے نہایت ایثار و ہمت سے کام لے کر اپنا اپنا کام شروع کر دیا۔مولانا سید سلیمان ندوی سیرت کی تالیف و تدوین میں مصروف ہو گئے۔مولوی مسعود علی صاحب ندوی نے انتظامی کاروبار سنبھالا، یعنی منیجر کے فرائض اپنے ذمہ لے لیے اور حاجی معین الدین صاحب ندوی تالیف و تصنیف میں مشغول ہو گئے۔

''بادش بخیر'' مولوی حاجی مسعود علی صاحب کا ذکر آ گیا ہے تو برسبیل تذکرہ یہ کہنا بے موقع نہ ہوگا کہ مولوی صاحب موصوف کو زمانۂ طالب علمی ہی سے انتظامی اور کاروباری معاملات سے دلچسپی تھی اور ان امور میں ایک خاص سلیقہ آپ کو حاصل تھا، جس کا علامہ کو بھی اعتراف تھا، چنانچہ وہ اپنے اپنے ذاتی امور کے انصرام میں مولوی صاحب موصوف کے اس سلیقہ سے فائدہ اٹھایا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اکثر اوقات علامہ کی شیروانیاں وغیرہ بھی مولوی مسعود علی صاحب کے مشورہ سے اور ان کے زیرنگرانی تیار ہوتی تھیں، دارالمصنفین کے منیجر ہونے پر ان کی یہ صلاحیت اور زیادہ نمایاں ہوگئی جب کہ انہوں نے اعظم گڑھ جیسے مقام پر ایک مطبع قائم کیا اور پھر بتدریج اس کو شاندار پیمانہ پر پہنچایا اور دارالمصنفین کے کاروبار کو غیر معمولی ترقی دی۔ یہ ایک ضمنی تذکرہ تھا۔

غرض حاجی معین الدین صاحب دارالمصنفین کے اوّلین رفقاء میں تھے، اور انہوں نے ایک خوشگوار ماحول میں اپنا کام شروع کیا، اس سے میرا مقصد یہ ہے کہ دارالمصنفین میں سب کام کرنے والے ندوی تھے اس لیے ان کے خیالات وافکار میں یکسانیت تھی اس کے علاوہ وہ سب علامہ کی بارگاہ فضل وکمال کے حاشیہ نشین تھے اور کم وبیش ان کے علمی فیوض وبرکات سے مستفید ہو چکے تھے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ علامہ کے مقصد حیات اور ندوۃ العلماء کے اعلیٰ نصب العین سے واقف تھے، ان حالات کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ دارالمصنفین کا کام اخلاص وہم آہنگی کی فضا میں شروع ہوا۔ آج دارالمصنفین کو ہندوستان کے علمی وقومی اداروں میں جو درجہ حاصل ہے وہ اسی اتحاد فکر وعمل کا نتیجہ ہے۔

اس زمانہ میں جو سب سے مقدم کام دارالمصنفین کے پیش نظر تھا وہ سیرت نبوی ﷺ کی تکمیل تھی۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ اسکیم بھی تھی کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے بعد خلفائے راشدینؓ اور صحابۂ کرامؓ کے مفصل حالات بھی مرتب کیے جائیں تاکہ خیرالقرون کی تاریخ کا ایک مکمل سلسلہ تیار ہوجائے، سیرت نبوی ﷺ کی تالیف وتدوین کی خدمت برادر محترم مولانا سید سلیمان صاحب ندوی نے اپنے ذمہ لی کیوں کہ سید صاحب ممدوح سیرت کے سلسلہ میں علامہ مرحوم کے ساتھ کام کرکے ایک خاص بصیرت حاصل کر چکے تھے اور علامہ کے دماغ میں جو سیرت کا خاکہ تھا اس سے واقف تھے۔

سلسلہ ''سیرۃ الصحابہ'' کا کام مولوی حاجی معین الدین صاحب کے سپرد کیا گیا۔ چنانچہ حاجی صاحب نے بڑی محنت سے اپنا کام شروع کیا اور اس سلسلہ کی دو جلدیں تالیف کیں۔ پہلی جلد کا نام ''خلفائے راشدین'' ہے اور دوسری کا ''مہاجرین'' یہ دونوں کتابیں دارالمصنفین کے سلسلۂ تصانیف میں ایک خاص درجہ رکھتی ہیں اور ان کے مطالعہ سے حاجی صاحب مرحوم کی محنت وتلاش کا اندازہ ہوتا ہے۔

دارالمصنفین میں کچھ زمانہ تک قیام کے بعد حاجی صاحب کتب خانہ ندوۃ العلماء کی ازسرنو ترتیب کے لیے لکھنؤ طلب کیے گئے، لکھنؤ ہم ندویوں کا گویا گھر ہے اور اپنی مادر درس گاہ کی کوئی خدمت ہر ندوی کے لئے باعث صد مسرت، اس لیے حاجی صاحب نے یہ خدمت خوشی سے قبول کی، حاجی صاحب کے ذمہ جو کام کیا گیا تھا، وہ بہت محنت طلب تھا، کتابوں کی مجوزہ فہرست کے جو عنوان تجویز کیے گئے تھے وہ ایسے تھے کہ ان کی خانہ پُری کے

بعد ہر کتاب کے مضامین اور مصنف کے متعلق ضروری معلومات حاصل ہو جاتے تھے لیکن ان معلومات کے حاصل کرنے کے لیے حاجی صاحب کو پوری توجہ سے ہر کتاب کا مطالعہ کرنا پڑتا تھا، میں برابر دیکھا کرتا تھا کہ حاجی صاحب یہ کام کیسی محنت وشوق سے انجام دیتے تھے۔

ندوۃ العلماء کے کتاب خانہ میں ایک معقول حصہ نادرالوجو قلمی کتابوں کا تھا، جو زیادہ تر علامہ شبلی نعمانی کے ذاتی کتاب خانہ سے منتقل ہو کر آئی تھیں، کیوں کہ ممدوح نے اپنا کتاب خانہ جو ساری عمر کی کمائی تھی اور برسوں کی تلاش وجستجو اور بلاد اسلامیہ کی سیاحت کا نتیجہ تھا، ندوۃ العلماء کے لیے وقف فرما دیا تھا، ترتیب فہرست کے وقت یہ قلمی کتابیں خاص توجہ سے دیکھی جاتیں اور ان کے متعلق تمام ضروری معلومات حاصل کیے جاتے تھے۔ مثلاً یہ کہ کتاب مصنف کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے یا کسی دوسرے شخص نے مصنف کے عہد میں لکھی ہے اور یہ کہ مصنف کی نظر سے گزری ہے یا نہیں، غرض حاجی صاحب کتاب کی جملہ خصوصیات تلاش کر کے اس کے وجوہ ندرت قلمبند کرتے تھے۔ حاجی صاحب نے اس سلسلہ میں جو محنت کی اس کا تفصیلی ذکر یہاں ممکن نہیں، اس کام سے خود حاجی صاحب کو یہ فائدہ پہنچا کہ قدماء کی تصنیفات پر ان کی نظر بہت وسیع ہو گئی اور تلاش وتحقیقات کا ایک خاص ذوق ان میں پیدا ہو گیا۔

لکھنؤ کے بعد حاجی صاحب ''بوہار امپیریل لائبریری کلکتہ'' میں ترتیب فہرست کے کام پر مامور ہوئے، حسب معمول یہاں بھی آپ نے اپنا کام بڑی ہمت وسلیقہ سے

انجام دیا۔ کلکتہ کے بعد آپ خدا بخش لائبریری یعنی ''اورینٹل لائبریری بانکی پور پٹنہ'' میں عربی کتابوں کی ترتیب فہرست کے کام پر مقرر ہوئے، نادرالوجود کتابوں کے لحاظ سے اس لائبریری کو جو شہرت واہمیت حاصل ہے وہ اہل بصیرت سے مخفی نہیں، حاجی صاحب ضلع پٹنہ کی ایک مردم خیز بستی کے رہنے والے تھے، اس لیے پٹنہ گویا حاجی صاحب کا وطن تھا۔

پٹنہ پہنچ کر حاجی صاحب اطمینان کے ساتھ اپنے کام میں مشغول ہو گئے اور مسلسل محنت وکوشش کے بعد ایک پر از معلومات فہرست کی چند جلدیں انگریزی میں مرتب کیں جو ان کی قابلیت کا خاص کارنامہ ہیں۔ یہ جلدیں حکومت کی طرف سے چھاپ کر شائع کر دی گئی ہیں، اور ارباب نظر واہل بصیرت نے ان کی خوبی کا اعتراف کیا ہے، کیوں کہ ان کے مطالعہ سے حاجی صاحب کی سخت تلاش اور وسعت نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔

حاجی صاحب نے انگریزی کی باقاعدہ تعلیم کہیں حاصل نہیں کی تھی۔ صرف ندوہ ہی میں تھوڑی انگریزی پڑھی تھی، لیکن اپنی ذہانت اور مسلسل محنت ومطالعہ سے اچھی قابلیت بہم پہنچائی تھی۔

چند سال بعد پٹنہ کی یہ جگہ تخفیف میں آ گئی، اس فرصت میں حاجی صاحب ایک ضروری کام سے دو چار روز کے لیے علی گڑھ بھی تشریف لائے، ایک مدت کے بعد ان کی یہ چند روزہ صحبت نعمت غیر مترقبہ معلوم ہوئی۔

پٹنہ لائبریری سے جدا ہونے کے بعد حاجی صاحب نے دائرۃ المعارف حیدرآباد میں ہندوستان کے قدیم تاریخی مقامات کا ایک جغرافیہ عربی زبان میں مرتب کیا،

جو شائع ہو چکا ہے، اس کے بعد کچھ مدت تک رام پور کے مشہور سرکاری کتاب خانہ میں کام کیا۔

ان تمام مراحل سے گزرنے کے بعد ۱۹۳۴ء میں حاجی صاحب کو پھر پٹنہ میں قیام کا موقع ملا، مدرسہ شمس الہدیٰ میں جو پٹنہ کی مشہور تعلیم گاہ ہے پرنسپل کا عہدہ خالی ہوا تو کمیٹی کے ارکان نے بلحاظ آپ کی سابقہ علمی خدمات وقابلیت کے آپ کو اس عہدہ پر مقرر کیا۔ یہ آپ کی آخری خدمت تھی جس پر آپ تادم واپسیں مامور رہے، اور حدیث کا درس دیتے رہے، یہاں تک کہ ۴ رمئی کی صبح کو اس دارِفانی سے رحلت فرمائی۔

جس زمانے میں حاجی صاحب اورینٹل لائبریری پٹنہ میں کام کر رہے تھے مجھے بمعیت مولوی سید طفیل احمد صاحب (علیگ) کلکتہ اور ڈھاکہ کے سفر کا اتفاق ہوا۔ واپسی پر حاجی صاحب کی ملاقات کے لیے پٹنہ میں قیام کیا، حاجی صاحب نے جس اخلاص و سچی مسرت کے ساتھ ہم لوگوں کا خیر مقدم کیا وہ آج تک یاد ہے، انہوں نے بڑے پیمانے پر ہم لوگوں کی دعوت کی، ندویوں کو جمع کیا، لوگوں سے تعارف کرایا، ان کی ہر ادا سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس ملاقات سے کس قدر مسرور ہیں۔

آخری مرتبہ ۱۹۳۸ء میں حاجی صاحب سے ملاقات ہوئی، جب کہ پٹنہ میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس تھا، اور اس سلسلہ میں مجھے بھی پٹنہ جانا پڑا، اس زمانے میں حاجی صاحب ''شمس الہدیٰ'' کالج میں پرنسل تھے۔ جب میں اُن سے ملاقات کے لیے وہاں پہنچا تو اس گرم جوشی سے وہ پیش آئے اور جو مسرت بے پایاں انہیں حاصل

ہوئی اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے، وہی اخلاص تھا اور وہی بے تکلفی، جو زمانۂ طالب علمی میں اُن کا شیوہ تھا، تھوڑی دیر کے لیے یہ محسوس ہونے لگا کہ ہم اُسی دورِ طالب علمی میں واپس آ گئے ہیں، جب کہ دنیا کے ہر قسم کے افکار و مصائب سے آزاد تھے اور زندگی کی کشمکش سے نا آشنا۔

اس موقع پر بھی حاجی صاحب نے تمام برادران ندوہ کو جمع کیا، پُر تکلف دعوت دی، اور عہد ماضی کی داستانیں دُہرائیں، اس ملاقات سے دل و دماغ کو ایک عجیب طرح کی تازگی حاصل ہوئی ۔ میری تحریک پر حاجی صاحب خود بھی اجلاس کانفرنس میں شریک ہوئے، اور دوسرے اساتذہ نیز طلبہ کو شرکت کی اجازت دی، یہ آخری ملاقات تھی جو اس عزیز ترین رفیق سے ہوئی، ان کی وفات کے بعد سے میں برابر یہ محسوس کر رہا ہوں کہ ایک ایسا جوہر گراں مایہ ضائع ہو گیا جس کا نعم البدل یا بدل اب کبھی نہیں مل سکتا، لیکن چارۂ کار کیا ہے۔

شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن

(الندوہ لکھنؤ جولائی ۱۹۴۱ء)

آہ! حاجی صاحب

☆ مولانا ریاست علی ندویؒ ☆

علمی و تعلیمی حلقہ میں یہ خبر دلی رنج وافسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ مدرسہ شمس الہدیٰ کے پرنسپل مولانا حاجی معین الدین صاحب ندوی نے ایک مختصر علالت کے بعد ۴ رمئی ۱۹۴۱ء کو صبح کے وقت اس دار فانی کو الوداع کہا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔۔۔۔مرحوم ہماری جماعت کے ایک سنجیدہ، پروقار اور خاموش علمی و تعلیمی خدمت انجام دینے والے تھے۔علامہ شبلی نعمانی مرحوم کے عہد میں دارالعلوم ندوۃ العلماء سے فارغ التحصیل ہوئے، فراغت کے بعد ندوۃ العلماء کے کتب خانہ کی ترتیب جدید پر مامور ہوئے، اسی اثناء میں علامہ مرحوم کی یاد میں دارالمصنفین کی بنا ڈالی گئی، اور مرحوم اس علمی مجلس کے اولین رفقاء کی جماعت میں داخل ہوئے، پھر رائل ایشیاٹک سوسائیٹی بنگال طلب کر لئے گئے۔اس کے بعد خدا بخش خاں مرحوم کی پٹنہ اورینٹل لائبریری میں تشریف لائے، چند سال گذرے کہ کتب خانہ کے مصارف میں تخفیف کی ضرورت پڑی اور حکومت کو ان کے خدمات سے محروم ہونا پڑا۔ یہاں ان کا خالی ہونا تھا کہ ریاست رامپور کے سرکاری کتب خانہ کی خدمت کی انجام دہی کے لئے طلب کئے گئے، اسی اثناء میں مدرسہ شمس الہدیٰ میں پرنسپلی کی جگہ خالی ہوئی تو حکومت بہار

نے ان کے پچھلے خدمات کا لحاظ کر کے اس عہدہ پر انہیں سرفراز کیا اور مدرسہ میں ان کی تعلیمی اور انتظامی صلاحیتوں کے غیر معمولی اثرات ظاہر ہوئے۔افسوس کہ عمر نے وفا نہ کی ،اور ۴۰ ،۴۵ سال کے سن میں رحلت کی۔ ہماری غیر معمولی توقعات ان سے وابستہ تھیں،افسوس کہ اب وہ خواب وخیال ہوگئیں۔

دارالمصنفین کے زمانۂ قیام کی دو کتابیں اردو زبان میں ان کی یادگار ہیں۔ایک خلفائے راشدین جس میں خلفائے اربعہ کے سوانح حیات ہیں۔اور دوسری سیر المہاجرین جلد اول۔مرحوم کا زیادہ وقت بانکی پور کے کتب خانہ میں گذرا، یہاں کی نادر قلمی کتابوں کی فہرست کی ترتیب وتدوین میں ان کی تحقیق وتلاش کی غیر معمولی صلاحیتیں صرف ہوئیں۔اور اس کتب خانہ کی فہرست کی ضخیم مجلدات انگریزی زبان میں مدون کیں جو اہل علم میں قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں۔

مرحوم طبعاً خاموش، صلح پسند اور سادہ مزاج تھے، ملنے جلنے والے سے اخلاق ومحبت سے پیش آتے تھے۔خداوند تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور صاحبزادوں اور عزیزوں کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔

(ندیم گیا،نظرات مئی ۱۹۴۱)

مولانا حاجی معین الدین ندوی کی رحلت

☆مولانا عبدالسلام قدوائی ندویؒ☆

الندوہ کے حلقہ میں یہ خبر نہایت رنج وافسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ پچھلے مہینے مولانا حاجی معین الدین صاحب ندوی رئیس الاساتذہ مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ نے ایک مختصر علالت کے بعد اس جہاں فانی سے انتقال فرمایا۔مرحوم ندوہ کے ابتدائی دور کے طالب علموں میں تھے۔اور یہاں کی تعلیم وتربیت کا بہت عمدہ نمونہ تھے،تصنیف وتالیف کا ذوق شروع ہی سے تھا ۔درسیات کی تکمیل کے بعد کچھ دنوں دارالمصنفین میں قیام رہا،خلفائے راشدین ومہاجرین حصہ اول اسی زمانہ کی یادگاریں ہیں۔تصنیف وتالیف کے ذوق نے کتب خانوں سے تعلق پیدا کیا۔اور یہ کام ایسا بھایا کہ زندگی کا ایک بڑا حصہ اسی میں صرف ہوا،کتب خانہ ندوۃ العلماء کی ترتیب وتہذیب کے علاوہ بوہارا امپیریل لائبریری کلکتہ،اورینٹل لائبریری پٹنہ اور اسٹیٹ لائبریری رامپور میں مدتوں یہ خدمت انجام دی۔آخر میں مدرسہ شمس الہدیٰ کے پرنسپل مقرر ہوئے اور زندگی کے آخری لمحات تک درس تدریس کے مبارک مشغلہ میں مصروف رہے۔خدا سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کی یہ خدمتیں قبول فرمائے اور انہیں اپنی رحمتوں سے سرفراز فرمائے۔(آمین)

(ماہنامہ الندوہ لکھنؤ، جون ۱۹۴۱ء)

علامہ سید شاہ معین الدین ندوی گیلانویؒ

☆ عطاء اللہ پالوی ☆

نام معین ندوی۔ والد کا نام سید وزیر جان، آبائی وطن شیخ پورہ ضلع مونگیر تھا۔ مگر علامہ موصوف اپنی نانہال موضع استھانواں ضلع پٹنہ (حال نالندہ، بہار شریف) میں ۱۸۹۱ء میں پیدا ہوئے، ابھی ایک برس کے ہوئے تھے کہ باپ اور ماں دونوں کا سایہ سر پر سے اٹھ گیا۔ نانی نے پرورش کی، گھر پر تعلیم دلائی، پھر ندوہ بھیجا، جہاں سے فارغ التحصیل ہو کر نکلے۔

۱۹۰۸ء میں علامہ موصوف کی نانی حج کے لئے گئیں تو اپنے یتیم نواسہ کو بھی ساتھ لیتی گئیں، کمسنی میں فریضہ حج کی ادائیگی ہندوستان میں بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے، عام طور سے ہندوستانی مسلمان اسی وقت حج کرتے ہیں جب وہ گناہ کرنے کے قابل نہیں رہتے اور سمجھتے ہیں کہ اب مرنے کا دن قریب ہے۔ جو لوگ کمسنی میں حج کر لیتے ہیں ہندوستانی رواج کے مطابق وہ بالعموم ''حاجی'' کے لفظ سے اس طرح یاد کئے جاتے ہیں جیسے کہ وہ ان کے نام کا جزو لاینفک ہو۔ چنانچہ ندوی صاحب کے بھی نام کا جزو اعظم ''حاجی'' ہی تھا اور اس پر جلا یوں ہوگئی کہ ''دارالمصنفین'' اعظم گڑھ میں ندوہ کے فاضل دو معین الدین بہ یک وقت

جمع ہو گئے تھے اور شناخت وتعارف کے لئے ضروری تھا کہ لفظ ''حاجی'' کو موصوف کے نام کا جزو اعظم بنا دیا جائے۔ چنانچہ وہ عمر بھر ''حاجی معین الدین'' ہی کہلاتے رہے۔

۱۹۱۰ء میں ندوی صاحب کی محسن نانی کا انتقال ہو گیا، مگر انہوں نے مرنے سے پہلے معقول آمدنی کی جائیداد یتیم ناتی کو لکھ دی تھی، اس لئے ندوی صاحب نے تعلیم کے سلسلے کو جاری رکھا۔ ۱۹۱۱ء میں موصوف نے ندوہ سے عالم کا امتحان پاس کیا اور اول آئے ۱۹۱۳ء میں درجہ تکمیل دینیات کا امتحان دیا اور دوم ہوئے، اسی سال نانی کی وصیت کے مطابق ندوی صاحب کی شادی اپنی خالہ زاد بہن سے گیلان میں ہو گئی۔

۱۹۱۴ء میں ''دارالمصنفین'' اعظم گڑھ قائم ہوا تو اس کے اسٹاف میں علامہ معین الدین ندوی بھی لے لئے گئے اور وہاں کی ملازمت ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۷ء تک رہی۔ علامہ سید سلیمان ندی نے معارف بابت ماہ مئی ۱۹۴۱ء کے اداریہ میں ''دارالمصنفین'' میں ندوی صاحب کے قیام کی مدت ایک سال لکھی ہے۔ غالباً کتابت کی غلطی ہے کیوں کہ ندوی صاحب وہاں تین سال رہے تھے، اس مدت میں انہوں نے ''سیر الصحابہ'' کی پہلی جلد ''خلفائے راشدین'' کے عنوان سے مرتب کی، اس کے بعد ''مہاجرین'' کا حصہ اول ترتیب دیا، موصوف کی یہ دونوں کتابیں ان کے دارالمصنفین چھوڑ دینے کے بہت بعد علی الترتیب ۱۹۲۷ء اور ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئیں۔

دارالمصنفین'' ایک پُر سکون علمی مقام تھا، مگر ندوہ سے اصرار زیادہ ہوا تو موصوف نے ''دارالمصنفین'' کو چھوڑ دیا اور کتب خانہ ندوہ کی ترتیب کے لئے لکھنؤ چلے گئے، وہاں وہ

۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۰ء تک کام کرتے رہے۔ پھر وہاں سے امپریل لائبریری کلکتہ کے ''بوہار کلکشن'' میں عربی مخطوطات کے کٹیلاگر بحال ہوکر کلکتہ چلے گئے۔ وہاں بھی انہوں نے تین برس کام کیا۔

۱۹۲۴ء میں خدابخش لائبریری کے عربی مخطوطات کے کٹیلاگر کی بحالی کا اعلان ہوا، چونکہ کلکتہ گھر سے بہت دور تھا اور پٹنہ موصوف کے گھر سے بہت قریب تھا، اس لئے ندوی صاحب نے اس کو ترجیح دیا اور خوش قسمتی سے ان کی بحالی بھی یہاں ہوگئی اس لئے انہوں نے کلکتہ کی ملازمت ترک کردی اور پٹنہ چلے آئے۔

خدابخش لائبریری میں عربی مخطوطات کے کٹیلاگر کی حیثیت سے ندوی صاحب نے ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۲ء تک کام کیا۔ یہ ملازمت ان کو بہت پسند تھی، کیوں کہ موصوف نہایت شریف، نیک طبع، متواضع اور خاموش طبیعت کے آدمی تھے اور خدابخش لائبریری کی ظاہری فضا نہایت پرسکون تھی، جو ان کو بہت پسند تھی، چنانچہ جب وہ یہاں سے ہٹائے گئے تو ان کو بڑا دکھ ہوا جس کا پتہ ان کی ایک تحریر سے ملتا ہے۔ ۱۹۳۵ء میں موصوف نے رسالہ ندیم گیا کے ''بہار نمبر'' میں خدابخش خاں پر ایک جامع طویل مضمون لکھا تھا، اس مضمون میں لائبریری کی ملازمت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ:

> ''حکومت کی مالی دشواریوں کے باعث فروری ۱۹۳۲ء میں خاکسار کا عہدہ معرض التوا میں آگیا۔۔۔۔۔۔ اور اس سے بہ حسرت واندوہ دستکش ہونا پڑا''۔

علامہ ندوی نہایت سنجیدہ وشائستہ انسان تھے،اس لئے وہ اور کیا لکھتے ؟مگر یہ بات قابل تسلیم نہیں ہے کہ حکومت کو مالی دشواری ہوگئی تھی اس لئے وہ ہٹا دیئے گئے تھے۔ایک مولوی معین الدین کے مشاہرہ کی بچت سے حکومت کی مالی دشواری کس حد تک دور ہوئی ہوگی؟ اصل یہ ہے کہ علامہ موصوف اس آرٹ سے بے بہرہ اوراس گُر سے ناواقف تھے کہ ہندوستانی بالخصوص بہاری ارباب اختیار کو کیسے رام کیا جاتا ہے؟ شاہداحمد دہلوی مدیر''ساقی'' نے ایک مرتبہ شوکت تھانوی کی ذلیل خوشامد گری کا اپنے ایک دوست سے ذکر کیا تھا تو اس نے کہا تھا:

''بھیا! یہاں اسی طرح کام چلتا ہے،پَول سٹنگ بڑی چیز ہے''

''پَول سٹنگ'' کا مطلب ہے ارباب اقتدار کو مکھن لگانا ،بچارے معین الدین سیدھے سادے آدمی''پَول سِٹنگ'' جانتے ہی نہ تھے۔لہذا مروجہ معیار پر پورے نہ اترے اور کہ دیا گیا کہ ایسا ہی خودی وخوداری کا خیال ہے تو اپنے گھر بیٹھو،مگر یہ کہا کیسے جاتا؟ اس لئے مالی دشواری ظاہر کی گئی اور جوں ہی وہ ہٹے ،سرکار کی ساری''مالی دشواری'' دور ہوگئی ۔ان کے بعد علامہ مسعود عالم ندوی بھی اپنے اسی عیب کی وجہ سے مستقل نہ ہو سکے تھے اور آخر میں اسی جرم میں وہ بھی ہٹا دیئے گئے تھے،ورنہ اس وقت حکومت کو کیا''مالی دشواری'' پیش آئی تھی؟ ہر چند کہ''مربی بیار ومربی بخور'' کا محاورہ قدیم ہے،مگر بہار میں اس مرض کا ہمیشہ زور رہا ہے، یہاں اہلیت وقابلیت کبھی قابل اعتنا نہ رہی ، بلکہ معیار یہ رہا کہ کون سب سے زیادہ چاپلوس اور خوشامدی ہے یا''پَول سٹنگ'' کا ماہر ہے۔

علامہ ندوی خدابخش لائبریری سے ہٹے تو ۱۹۳۳ء میں ''دائرۃ المعارف'' (حیدرآباد) سے وابستہ ہوگئے اور وہاں انہوں نے قدیم ہندوستانی تاریخی مقامات کا عربی زبان میں ایک جغرافیہ لکھا جو دائرہ کی طرف سے شائع ہوا۔ ۱۹۳۴ء میں وہاں سے الگ ہوئے تو موصوف رضا لائبریری رامپور میں ملازم ہوگئے، وہاں کچھ ہی دن رہے تھے کہ مدرسہ اسلامیہ پٹنہ میں پرنسپل کی جگہ خالی ہوئی اور اس عہدہ پر علامہ ندوی کی تقرری ہوگئی اور ۵ نومبر ۱۹۳۴ء کو موصوف نے آفس جوائن کرلیا اور کام کرنے لگے تا آنکہ ۴ مئی ۱۹۴۱ء کو موصوف بہ عمر پچاس برس قبل از وقت انتقال فرما گئے۔

علامہ ندوی بڑے ذہین وفطین اور نہایت محنت کش واقع ہوئے تھے۔انہوں نے ندوہ کے دوران نصاب کی ریڈروں کے سوا انگریزی زبان کی باضابطہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی، مگر بعد میں موصوف نے انگریزی زبان میں پوری دستگاہ حاصل کرلی تھی۔عمر کا بیشتر حصہ موصوف نے کیٹلاگنگ کے دشت کی سیاحی میں گزارا تھا،اس لئے انہوں نے آٹھ برس کی ملازمت میں سات جلدیں تیار کرڈالی تھیں جو نہایت معیاری تسلیم کی جاتی ہیں۔یہ جلدیں حسب ذیل ہیں۔

جلد(۱۲) ۔جو ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئی۔

جلد(۱۵)۔جو ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئی

جلد(۱۸)۔حصہ اول جو ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی

جلد(۱۹)۔حصہ دوم جو ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی

جلد(۲۰) ۔جو۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی

یہ وہ جلد ہے جس کو ادھوری چھوڑ کر ڈاکٹر عظیم الدین احمد صاحب جرمنی چلے گئے تھے اور ندوی صاحب نے اس کو مکمل کیا۔

جلد(۲۳) جو۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی

جلد(۲۴) جو۱۹۴۰ء میں شائع ہوئی۔

اس جلد کو مولوی عبدالحمید صاحب مکمل نہ کر پائے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا،اس کو ندوی صاحب نے مکمل کیا۔

دارالمصنفین کے اولین رفیق

حضرت مولانا حاجی معین الدین ندویؒ

☆طلحہ نعمت ندوی☆

مولانا حاجی معین الدین ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا شمار ملک کے ممتاز اہل علم وقلم میں ہوتا ہے ۔وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مایہ ناز سپوت ،دارالمصنفین کے ممتاز مصنف اوراستھانواں علاقہ وبہار شریف بلکہ پورے صوبہ بہار کے قابل فخر فرزند تھے۔

حیات سلیمان مصنفہ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی(۱) کے حسب تصریح دارالمصنفین کا سب سے پہلا عملہ پانچ افراد پر مشتمل تھا جن میں مولانا مسعود علی صاحب ندوی اس کے منیجر تھے، علامہ سید سلیمان ندوی ناظم ،اوران کے ساتھ ممتاز عالم ومصنف مولانا عبدالسلام ندوی تھے۔اور مولانا حاجی سید معین الدین ندوی رفیق تھے،ان کے علاوہ ایک ملازم تھا۔ان چاروں بزرگوں میں تین شخصیتیں تو ماشاءاللہ مشہور زمانہ ہیں اوران کے حالات بھی مرتب ومحفوظ ہیں لیکن حاجی صاحب کے حالات بہت زیادہ نہیں ملتے ،اس لئے جو کچھ مل سکا ذیل میں پیش کیا جارہا ہے۔

حاجی صاحب کے سوانح میں ان کی طالب علمی اور اس کے بعد کے حالات عام طور پر معروف ہیں، البتہ ان کی پیدائش اور بچپن کا حال بہت کم ملتا ہے، ان کی وفات کے بعد ہی بانی مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ (جسٹس نورالہدیٰ بن شمس الہدیٰ) کے حالات اور مدرسہ کے ذکر میں ایک مختصر کتابچہ ''نور ہدیٰ'' شائع ہوا تھا جس میں ان کے ساتھ مدرسہ اور اس کے ذمہ داران وممتاز اساتذہ کا بھی ذکر ہے، حاجی صاحب اس مدرسہ کے پرنسپل تھے، اور اسی عہدہ پر وفات پائی تھی اسی لئے ان کا بھی مختصر تذکرہ ہے۔ اس کتاب میں ان کے بچپن کے کچھ حالات بھی درج ہیں جو بظاہر ان کے گھر والوں اور اہل خاندان سے معلوم کر کے ہی لکھے گئے ہوں گے، اس لئے حاجی صاحب کے ابتدائی حالات کا تنہا ماخذ وہی ہے، بعد میں جس کسی نے ان کے ابتدائی حالات ذکر کئے اس کی بنیاد اسی کتاب پر رکھی۔

اس اطلاع کے مطابق حاجی صاحب کے والد کا نام سید جان محمد تھا، مزید ان کے دادا کا نام اور ان کے والد کے حالات، سلسلۂ نسب یہ تمام تفصیلات ہمارے علم میں نہیں، ہاں یہ طے ہے خانوادہ سادات سے ان کا تعلق تھا۔ ان کا مولد ان کی نانہال استھانواں کی مردم خیز بستی تھی، جہاں وہ ۱۸۹۱ء میں پیدا ہوئے۔ (۲) نور ہدیٰ میں ان کا آبائی وطن شیخ پورہ بتایا گیا ہے اور قریہ گیلانی کو ان کی سسرال لکھا گیا ہے، (اور یہی بات بعد میں ان کی اتباع میں عطاء اللہ پالوی نے بھی لکھی ہے) لیکن یہ بات بظاہر درست نہیں معلوم ہوتی (۳)، کیوں کہ حاجی صاحب کے مضمون (حیات بانی کتب خانہ خدا بخش شائع شدہ ماہنامہ ندیم گیا) میں ان کے نام ساتھ گیلانی کا لفظ ملتا ہے اور ان کی زندگی ہی میں شائع ہوا ہے، ان کے اعزہ بھی

ان کی دادیہال گیلانی ہی بتاتے ہیں، یہ ممکن ہے کہ ان کے والد ملازمت یا کسی اور وجہ سے شیخ پورہ شہر میں مقیم ہوگئے ہوں جو بستی گیلانی سے ایک گھنٹہ کے فاصلہ پر ہے، گیلانی کے معروف خانوادہ سادات سے ان کا تعلق تھا۔لیکن حاجی صاحب کا مولدان کا نانہالی گاؤں استھانواں تھا، اور والدین کے بچپن میں انتقال ہوجانے کی وجہ سے انہوں نے استھانواں ہی میں اپنی نانی صاحبہ کی آغوش تربیت میں پرورش پائی اس لئے وہ مستقل اپنی نانہال ہی میں مقیم ہوگئے تھے اور وہی ان کا وطن بن گیا تھا، وہاں ان کا گھر بھی موجود تھا جواب جناب نعیم الحق صاحب (سرپنچ) مرحوم کا گھر ہے۔حاجی صاحب کے رشتہ کے برادر نسبتی الحاج شعیب احمد گیلانی مرحوم نے راقم کو اس کی اطلاع دی تھی۔حاجی صاحب ۱۹۰۸ء میں اپنی نانی صاحبہ کے ساتھ حج کے لئے تشریف لے گئے، افسوس کہ ان کی طالب علمی کے حالات بہت کم معلوم ہیں، کہ انہوں نے بچپن میں کن اساتذہ سے تعلیم حاصل کی اور کب ندوہ پہنچے۔ ندوہ کے دور قیام وطالب علمی کے کچھ واقعات ہمیں ان کے رفیق مولانا اکرام اللہ خاں صاحب ندوی مدیر الندوہ وکانفریس گزٹ علی گڑھ کی یادوں سے معلوم ہوسکے، انہوں نے حاجی صاحب کی وفات پر الندوہ (جولائی ۱۹۴۱ء) میں ایک مضمون تحریر فرمایا تھا جس میں اپنے اور ان کے دور طالب علمی کے واقعات ذکر کرکے یادوں کو تازہ کیا تھا۔ان کی تصریح کے مطابق وہ، مولانا مسعود علی ندوی اور حاجی صاحب تینوں ہم درس تھے، انہوں نے حاجی صاحب کی طالب علمی کے زمانہ ہی سے ان کی شرافت ومروت اور حسن اخلاق، دوسروں کی برائیوں سے گریز اور حتی الامکان اس سے دوری کا ذکر کیا ہے، جس سے حاجی صاحب کی

فطری وطبعی شرافت کا اندازہ ہوتا ہے۔(۴)

مولانا اکرام اللہ صاحب نے مزید لکھا ہے کہ:

''حاجی صاحب طالب علمی کے زمانہ میں بلند نظر و باوقار تھے، عادات واطوار میں شائستگی اور خودداری تھی اور عزت نفس کا پاس، اس لیے کوئی مبتذل اور گھٹیا حرکت ان سے کبھی سرزد نہیں ہوتی تھی اور وہ ہمیشہ عامیانہ وسوقیانہ صحبتوں سے بچتے تھے۔ البتہ اپنے مخصوص احباب کے حلقے میں وہ بے تکلف اور خوش مزاج نظر آتے تھے، حفظ مراتب کا انہیں خاص خیال رہتا تھا۔ اس لیے وہ اپنے سے کم عمر اور چھوٹی جماعتوں کے طلبہ کو کبھی اس کا موقع نہیں دیتے تھے کہ وہ ان سے مساویانہ بے تکلفی کے ساتھ بات چیت کریں، اسی طرح وہ اپنے اساتذہ اور بزرگوں کا پورا احترام کرتے اور ان کے ساتھ تہذیب وشائستگی سے پیش آتے تھے۔ لیکن اس میں بھی اعتدال پیش نظر تھا، کسی بلند شخصیت کے سامنے جھکنا یا اس کی ہاں میں ہاں ملانا ان کی عادت نہ تھی، وہ طبعاً آزاد خیال تھے اور بے نیازی کی شان ان کے ہر انداز سے نمایاں تھی''۔(۵)۔

حاجی صاحب نے دینیات میں تخصص کے ساتھ تقریباً ۱۹۱۲ء میں ندوہ سے فراغت حاصل کی، مولانا اکرام اللہ خاں صاحب کی اطلاع کے مطابق اس کے بعد وہ وطن چلے گئے اور خود مولانا ندوہ میں الندوہ کے مدیر ہو گئے، شاید اسی دوران (جیسا کہ ان کے سب سے پہلے تذکرہ میں نور ہدیٰ میں لکھا ہے) حاجی صاحب نے انگریزی میں محنت کر کے

دسترس حاصل کی ،اوراپنے ایک دوست سے اس سلسلہ میں مدد لی ممکن ہے اس کے علاوہ بھی حاجی صاحب کی کچھ مشغولیات رہی ہوں لیکن اس کا ذکر نہیں ملتا۔

۱۹۱۵ء میں دارالمصنفین کے قیام کے بعد حاجی صاحب وہاں تشریف لے آئے ۔علامہ شبلی کے ان کے نام لکھے ہوئے تین خطوط مکاتیب شبلی میں شامل ہیں،اور یہ سب کے سب ۱۹۱۴ء کے لکھے ہوئے ہیں۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ علامہ شبلی کے عزیز شاگردوں میں تھے۔

جب دارالمصنفین میں کام کا آغاز ہوا تو جہاں علامہ سید سلیمان ندویؒ نے خود علامہ شبلی کے مجوزہ سیرت النبی کی تکمیل کی ذمہ داری قبول کی وہیں حاجی صاحب کو صحابۂ کرام کی سیرت مبارکہ کی ترتیب کی ذمہ داری سونپی گئی،جس میں دوجلدویں حاجی صاحب نے علامہ شبلی کے منہج کے مطابق بہت خوبی سے مکمل کیں،پہلی جلد خلفائے راشدین کے حالات پر ہے اوراسی نام سے شائع ہوئی ہے،دوسری جلد مہاجرین جلد اول کے نام سے مرتب کی جس کا آخری حصہ ان کے ہم نام مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے مرتب کیا،اوراس سلسلہ کی تکمیل کی ۔کیوں کہ حاجی صاحب کو چند ہی سالوں کے بعد اپنے مادر علمی ندوۃ العلماء کی طلب پر وہاں کے کتب خانہ کی فہرست مخطوطات کی ترتیب کے لئے جانا پڑا،اس وقت ان کے رفیق مولانا اکرام اللہ خاں ندوی بھی وہیں تھے،گرچہ ان کی ادارت میں نکلنے والا رسالہ الندوہ بند ہو چکا تھا،وہاں دونوں رفقاء کو پھر ایک بار یکجائی کا موقع ملا،خان صاحب نے حاجی صاحب کی محنت اور کدوکاوش کا مشاہدہ ان الفاظ میں درج کیا ہے:

''حاجی صاحب کے ذمہ جو کام کیا گیا تھا، وہ بہت محنت طلب تھا، کتابوں کی مجوزہ فہرست کے جو عنوان تجویز کیے گئے تھے وہ ایسے تھے کہ ان کی خانہ پُری کے بعد ہر کتاب کے مضامین اور مصنف کے متعلق ضروری معلومات حاصل ہو جاتے تھے لیکن ان معلومات کے حاصل کرنے کے لیے حاجی صاحب کو پوری توجہ سے ہر کتاب کا مطالعہ کرنا پڑتا تھا، میں برابر دیکھا کرتا تھا کہ حاجی صاحب یہ کام کیسی محنت وشوق سے انجام دیتے تھے''۔(۷)

حاجی صاحب کے لئے یہ کام ایسا مبارک ثابت ہوا کہ پھر ان کی زندگی کا بیشتر حصہ مختلف مقامات میں اسی خدمت میں بسر ہوا، اور یہی فن ان کی شناخت بن گیا۔

حاجی صاحب اس کام کی تکمیل کے بعد پھر دوبارہ دارالمصنفین لوٹ کر نہیں آئے ، بلکہ اسی کام کی مناسبت سے انہیں امپریل لائبریری کلکتہ میں طلب کیا گیا، جہاں انہوں نے مخطوطات کی فہرست ہی کی ترتیب کی خدمت انجام دی۔(۸) حاجی صاحب نے دارالمصنفین میں تین سال (۱۹۱۴ تا ۱۹۱۷) خدمت انجام دی، اس کے بعد ندوہ میں بھی دو سال (۱۹۱۸ تا ۱۹۲۰) گذارے ،کلکتہ میں بھی انہوں نے تین برس (۱۹۱۲ تا ۱۹۲۳) کام کیا۔

''۱۹۲۴ء میں خدا بخش لائبریری کے عربی مخطوطات کے کٹیلاگر کی بحالی کا اعلان ہوا، چونکہ کلکتہ گھر سے بہت دور تھا اور پٹنہ موصوف کے گھر سے بہت قریب تھا، اس لئے حاجی صاحب نے اس کو ترجیح دیا

اورخوش قسمتی سے ان کی بحالی بھی یہاں ہوگئی اس لئے انہوں نے کلکتہ کی ملازمت ترک کردی اور پٹنہ چلے آئے۔خدابخش لائبریری میں عربی مخطوطات کے کٹیلاگر کی حیثیت سے حاجی صاحب نے ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۲ء تک کام کیا۔یہ ملازمت ان کو بہت پسند تھی، کیوں کہ موصوف نہایت شریف، نیک طبع ،متواضع اور خاموش طبیعت کے آدمی تھے اور خدابخش لائبریری کی ظاہری فضا نہایت پرسکون تھی، جو ان کو بہت پسند تھی''۔(۹)

حاجی صاحب نے بانی کتب خانہ پر اپنے مضمون میں خود لکھا ہے:

''فروری ۱۹۲۴ء میں خاکسار کا تقرر عمل میں آیا، درحقیقت یہی وہ وقت ہے جب سے عربی مخطوطات کی فہرست سازی کا کام پوری تیزی اور تندہی کے ساتھ شروع ہوا ممکن تھا کہ عربی مخطوطات کی فہرست بھی مکمل ہوکر اہل علم کے ہاتھوں میں پہنچ جائے گی مگر حکومت کی مالی دشواریوں کے باعث فروری ۱۹۲۴ء میں خاکسار کا عہدہ معرض التوا میں آگیا، خاکسار نے اپنی ہشت سالہ مدت ملازمت میں فہرست کی چھ جلدیں مکمل کیں اور ساتواں کا ایک حصہ مکمل ہو چکا تھا کہ اس سے بہ حسرت اندوہ دست کش ہونا پڑا''(۱۰)

لیکن حاجی صاحب کو اس کام اور کتب خانہ سے ایک انسیت ہوگئی تھی اس لئے جب انہیں مدرسہ شمس الہدیٰ میں تقرری کے بعد اس سے قریب رہ کر استفادہ کا موقع پھر ملا ،جس کا ذکر کرتے ہوئے حاجی صاحب نے لکھا ہے:

''جب خاکسار کا عہدہ معرض تخفیف میں آیا تو بہ ظاہر اس عام نوازش سے استفادہ کی امید باقی نہیں رہی مگر مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ میں کی پرنسپلی ملنے پر اس ناچیز کی دیرینہ خدمت بھی بالآخر سعی نامشکور نہیں رہی'' (۱۱)۔

خدا بخش لائبریری سے سبکدوشی کے بعد حاجی صاحب ۱۹۳۳ء میں دائرۃ المعارف حیدر آباد چلے گئے، وہاں تقریباً ایک سال رہے، اس دوران وہاں سے حافظ ابن حجر کی ''الدرر الکامنہ'' شائع ہوئی جو آٹھویں صدی کے اہل علم کے تذکرہ پر مشتمل ہے، اس میں ہندوستان کے اہل علم کا ذکر نہیں تھا اس لئے اس کے ساتھ مولانا سید عبدالحی حسنی کی نزہۃ الخواطر کی دوسری جلد جو آٹھویں صدی کے ہندوستانی بزرگوں پر ہے شامل کر دی گئی، اس میں جو ہندوستانی مقامات کے نام آئے وہ عربوں کے لئے نئے تھے، اس لئے حاجی صاحب کو عربی میں ان مقامات کے تعارف کی ذمہ داری دی گئی، کتاب کی اشاعت کا کام ان کے ہم وطن و عزیز مولانا سید ہاشم ندوی استھانوی کے زیر ادارت ہوا تھا، عجب نہیں کہ انہوں نے ہی ان کو یہ ذمہ داری سونپی ہو، بہر حال ''معجم الامکنۃ التی لھا ذکر فی نزھۃ الخواطر'' کے نام سے یہ کتاب شائع ہو گئی اور اس طرح انہیں اپنے استاذ مولانا سید عبدالحی حسنی کے کام کی توضیح و ترجمانی کا بھی موقع ملا۔ تصانیف کے ذیل میں ہم اس کتاب کا جائزہ لیں گے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی کے مکاتیب بنام مولانا عبدالباری ندوی میں جا بجا حاجی صاحب کا ذکر ہے جب حیدر آباد میں موجود تھے، اس وقت مولانا اپنے وطن میں تھے، ایک جگہ لکھتے ہیں ''حاجی صاحب کو سلام فرما دیجئے گا، افسوس ان کی خدمت کچھ نہ کر سکا، معلوم

نہیں حاجی صاحب کی کارروائی کا کیا انجام ہوا''۔یعنی اس وقت حاجی صاحب پٹنہ کی ملازمت ختم ہوجانے کی وجہ سے حیدر آباد تشریف لے گئے تھے،شاید وہاں ان کو دائرۃ المعارف میں عارضی کام مل گیا تھا،مولانا گیلانی نے اس کی اطلاع کے بعد مولانا عبدالباری کو لکھا کہ'' حاجی صاحب کوفرمائیں کہ وہ اپنی حالت اور جونئی راہ اللہ تعالیٰ نے اپنے لطف وکرم سے کھولی ہے اس کی نوعیت کیا ہے ضرور لکھیں، نیز نزہۃ الخواطر کے اندکس کا کیا ہوا، ڈاکٹر صاحب سے ذکر آیا تھا فرمایا کہ والد صاحب نے ایسے مقامات کا ذکر اپنی جغرافی جلد میں کیا ہے،شاید وہ حصہ طبع بھی ہو چکا ہے،ضرورت یقیناً اس کی ہوگی،ان سے لے کر ان شاءاللہ بھیج دوں گا، ورنہ ساتھ لاؤں گا''۔(۱۲)اس کے بعد جب حاجی صاحب کی وفات ہوئی تو اس وقت مولانا وطن ہی میں تھے،اس کی اطلاع بھی مولانا عبدالباری صاحب کو ان الفاظ میں دی'' تازہ زخم ہے کہ ہم لوگوں کے رفیق قدیم حاجی معین الدین ندوی بلڈ پریشر کے عام مرض میں پرسوں پٹنہ میں رحلت فرما گئے،اناللہ وانا الیہ راجعون''۔(۱۳)

اس کے بعد تقریبا ایک یا ڈیڑھ سال حاجی صاحب رامپور کے مشہور زمانہ کتب خانہ میں رہے نہیں معلوم کہ وہاں حاجی صاحب کو بلایا گیا تھا یا از خود دائرۃ المعارف چھوڑ کر تشریف لے گئے تھے،اور اس کے اسباب کیا تھے، وہاں اس مختصر مدت میں حاجی صاحب نے حاجی عارف قندھاری کی'' طبقات اکبری'' کی تصحیح کی اور اس پر انگریزی میں حواشی لکھے،جس کی وضاحت اس کتاب کے مقدمہ میں مشہور محقق امتیاز علی عرشی نے ان الفاظ میں کی ہے:

''بحکم بندگان اعلیٰ حضرت نواب رامپور دام اقبالہ کار تصحیح وتحشیہ بہ حاجی معین الدین ندوی مرحوم کہ دوران زمان تالیف فہرست خطیات فارسی کتاب خانہ رضا مشغول بودہ تفویض شد، مشار الیہ باکمال دقت نظر کار مفوض را بانجام رسانید، وحواشی را بفرمودۂ جناب سید ابو محمد مرحوم کہ نگران اعلیٰ کتاب خانہ بودند بالنگلیسی نوشت'' (۱۴)

''اعلیٰ حضرت نواب رامپور دام اقبالہ کے حسب الحکم اس کتاب کی تصحیح وتحشیہ کا کام حاجی معین الدین ندوی مرحوم کے سپرد کیا گیا جو اس زمانہ میں کتب خانہ رضا کی فارسی مخطوطات کی فہرست کی تصنیف وترتیب میں مشغول تھے، موصوف نے پوری دقت نظر کے ساتھ اپنے مفوضہ کام انجام دئے اور اس کو تکمیل تک پہنچایا، اور کتب خانہ کے نگران اعلیٰ سید ابو محمد مرحوم کی ایما پر انگریزی میں اس کے حواشی لکھے''۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حاجی صاحب اصلا وہاں اپنے فن یعنی مخطوطہ شناسی ہی کے کام اور اس کی ترتیب کے لئے گئے تھے، لیکن وہاں کے ناظم کے حکم پر انہوں نے اس کتاب کی تدوین کا بھی کام کیا، البتہ حاجی صاحب نے وہاں جن مخطوطات پر کیا کام کیا اس کا بہت زیادہ علم نہیں ہوتا۔

لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد جب مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں پرنسپل کی جگہ خالی ہوئی تو حاجی صاحب کی سابقہ خدمات کی بنا پر حکومت بہار نے اس عہدہ کے لئے ان کو

طلب کیا، حاجی صاحب پٹنہ میں ایک طویل عرصہ گذار بھی چکے تھے، اس کے مشہور کتب خانہ سے مانوس تھے، نیز یہ گویا ان کا وطن ہی تھا اس لئے حاجی صاحب نے یہ پیشکش قبول کر لی، اور نومبر ۱۹۳۵ء کو وہ اس خدمت پر بحال ہوئے۔ حاجی صاحب گرچہ اب تک علمی و تصنیفی کاموں ہی میں لگے ہوئے تھے، تدریسی اور انتظامی میدان میں انہیں اپنے جوہر دکھانے کا موقع نہیں ملا تھا لیکن جب وہ اس میدان میں آئے تو یہاں بھی اپنی ذمہ داری بحسن وخوبی نبھائی، حاجی صاحب کے دور ادارت کو عام طور پر مدرسہ شمس الہدی کا کامیاب دور مانا جاتا ہے، حاجی صاحبؒ کی پانچ سالہ خدمات نے مدرسہ کو ترقی کی راہ پر گامزن کر دیا اور اس کے لئے وہ رہنما خطوط واضح کئے جو آج بھی اس کے لئے سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں، حاجی صاحب نے یہاں انتظامی ذمہ داریوں کے ساتھ حدیث شریف کی اعلی کتابوں کی تدریس کی خدمت بھی انجام دی، ان کے اس دور کے تلامذہ میں ہمیں دو مشہور و ممتاز نام ملتے ہیں ،ایک مشہور محقق جناب مختار الدین احمد آرزو ہیں جنہوں نے ان سے بخاری شریف پڑھی تھی ،دوسرے ممتاز اہل قلم جناب مولانا سید عروج احمد صاحب قادری ہیں جنہوں ان سے استفادہ کیا اور اپنے دور طالب علمی ہی میں حاجی صاحب ہی کی زیر نگرانی طلبہ کا ہنامہ الشّمس نکالا جو مدرسہ کی تاریخ میں شاید طلبائے مدرسہ کی انجمن کا پہلا باضابطہ رسالہ تھا جس میں حاجی صاحبؒ کا مشورہ اور ان کی نگرانی ہی کو دخل تھا۔

حاجی صاحبؒ نے یہاں پانچ سال خدمت انجام دے کر دوران خدمت ہی ۴ رمئی ۱۹۴۱ء کو وفات پائی اور پٹنہ ہی میں مدفون ہوئے۔ اسی سال حاجی صاحب کو ان کی مادر علمی

ندوالعلماء کا رکن منتخب کیا گیا تھا جیسا کہ الندوہ کے اپریل ۱۹۴۱ء کے شمارہ میں مولانا عبدالغفور شرر ندوی معاون ناظم ندوۃ العلماء کے قلم سے کارروائی رپورٹ میں اس کی اطلاع ہے ،لیکن افسوس کہ اسی سال کے دو ماہ بعد جون کے شمارہ میں مدیر رسالہ مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی کے قلم سے شذرات میں ان کا ماتم ہے۔

ان کی وفات پر علامہ سید سلیمان ندوی ،مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی ،مولانا اکرام اللہ خاں ندوی اور مولانا ریاست علی ندوی نے اپنی تحریروں کے ذریعہ ان کا ماتم کیا اور ان کے فضائل وکمالات بیان کئے۔

حاجی صاحب کی تصانیف کا دائرہ اردو،عربی اور انگریزی تینوں زبانوں کو محیط ہے ،اس سے ان کی علمی عظمت واستعداد کا اندازہ لگانا مشکل نہیں،حاجی صاحب نے آخر عمر میں حدیث کی بلند پایہ کتابوں کی تدریس کی خدمت بھی انجام دی اس سے علم حدیث میں ان کی دسترس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے،اردو زبان اور تاریخ میں ان کی دسترس کی شہادت تو خود ان کی کتابوں سے ملتی ہے۔لیکن حاجی صاحب کا اصل کمال جس میں ان کی عبقریت کی شہادت موجود ہے وہ مخطوطہ شناسی کی صلاحیت ہے،غرض یہ کہ حاجی صاحب ندوہ العلماء کے باکمال فضلاء اور دارالمصنفین کے ممتاز رفقاء میں تھے۔

حاجی صاحب کی خدمات میں مرکزیت تو ان کے علمی وتصنیفی کاموں ہی کو حاصل ہے لیکن انہوں نے اپنی زندگی کے آخری پانچ سال تدریسی خدمت میں بھی گذارے،اور انتظامی ذمہ داریاں بھی نبھائیں،طلبہ کی تربیت بھی کی۔

حاجی صاحب بہت زیادہ زود نویس نہیں تھے ،انہوں نے مجلّات میں مضامین ومقالات بہت کم ہی تحریر کئے ،دارالمصنفین کے دوارن قیام بھی معارف میں ان کے بہت کم ہی مضامین شائع ہوئے ،البتہ وہ معارف کے علمی معاون ضرور رہے ہوں گے ،لیکن حاجی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اس کی اہمیت ومعنویت سے کوئی انصاف پسند انکار نہیں کرسکتا، کیوں کہ تصنیف کا اصول ہے کہ اس میں کمیت نہیں بلکہ کیفیت اور معنویت کا اعتبار ہوتا ہے ،اس اعتبار سے حاجی صاحب نے جو کام کئے وہ بجائے خود بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ان کی باضاطہ علمی کاوش تو دارالمصنفین سے شائع شدہ ان کی دو کتابیں ’’خلفائے راشدین‘‘ اور’’مہاجرین‘‘ ہیں۔اول الذکر کتاب کے آغاز میں خلافت راشدہ کی شرح وتوضیح میں ان کا مقدمہ بھی اپنی قدر وقیمت میں کسی تصنیف سے کم نہیں ،زبان وبیان کی خوبیاں بھی بدرجہ اتم موجود ہیں۔اردو میں حاجی صاحب کی صرف یہی دو کتابیں ہمارے علم میں ہیں۔عربی میں ان کا رسالہ ” معجم الامکنة التی جاء ذکر ھا فی نزھة الخواطر“ان کی عربی انشا نگاری اور تحقیق دونوں کا نمونہ ہے، جو حاجی صاحب نے دائرۃ المعارف حیدرآباد کے دوران قیام تحریر فرمایا تھا،حاجی صاحب کی یہ کتاب بقامت کہتر بقیمت بہتر کی مصداق ہے، اس میں ہندوستان کے اہم مقامات کا حروف تہجی کی ترتیب پر تعارف کرایا گیا ہے، ہر تعارف اختصار وجامعیت کا نمونہ ہے،اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کی علمی تاریخ سے متعلق عرب فضلاء کی کتابوں میں اس کے حوالے نظر آتے ہیں ،اس پر علامہ سید سلیمان ندوی علیہ الرحمۃ کا عربی میں مقدمہ ہے، نیز اس کتاب کا اردو ترجمہ

بھی خدابخش لائبریری نے شائع کر دیا ہے۔

حاجی صاحب کا سب سے اہم کام قدیم مخطوطات کی مفصل فہرست کی کئی جلدیں ہیں جو انہوں نے مختلف کتب خانوں کے قیام کے دوران تیار کیں، اس نوع کا سب سے پہلا کام خود انہیں اپنی مادر علمی دارالعلوم ندوۃ العلماء میں کرنے کا موقع ملا، اس کے بعد امپیریل لائبریری کلکتہ اور پھر ایک طویل عرصہ خدابخش لائبریری پٹنہ میں گذارنے کا موقع ملا ،اور اخیر میں کتب خانہ رامپور میں بھی انہوں نے یہی خدمت انجام دی ،لیکن خدابخش لائبریری کے انگریزی میں مفصل فہارس مخطوطات کے علاوہ مذکورہ کتب خانوں میں سے کسی اور کتب خانہ میں حاجی صاحب کی مرتب کردہ فہرست ہمیں نہیں ملتی۔

حاجی صاحب نے خدابخش لائبریری میں فہرست مخطوطات کی جو سات جلدیں انگریزی میں مرتب کی ہیں وہ عطاء اللہ پالوی کی تصریح کے مطابق حسب ذیل ہیں:

جلد (۱۲) ۔جو ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئی۔

جلد (۱۵)۔جو ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئی

جلد (۱۸)۔حصہ اول جو ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی

جلد (۱۹)۔حصہ دوم جو ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی

جلد (۲۰)۔جو ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی

یہ وہ جلد ہے جس کو ادھوری چھوڑ کر ڈاکٹر عظیم الدین احمد صاحب جرمنی چلے گئے تھے اور حاجی صاحب نے اس کو مکمل کیا۔

جلد (۲۳) جو ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی

جلد (۲۴) جو ۱۹۴۰ء میں شائع ہوئی۔

اس جلد کو مولوی عبدالحمید صاحب مکمل نہ کر پائے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا، اسے بھی حاجی صاحب نے مکمل کیا۔ (۱۵)

فروری ۱۹۲۸ء کے معارف کے شمارہ میں حاجی صاحب کی تیار کردہ جلد پر ''باب التقریظ والانتقاد'' کے تحت ایک مفصل اور وقیع تبصرہ شائع ہوا تھا۔ جس کے اخیر میں (ج) لکھا ہے جو شاید مولانا عبدالجلال ندوی کا مخفف ہے۔ اس میں انہوں نے ''مشرقی کتب خانہ بانکی پور کی بارہویں جلد مرتبہ مولوی حاجی معین الدین صاحب مصنف خلفائے راشدین'' کے زیر عنوان پہلے یہ لکھا کہ ''اس کتب خانہ کی متعدد فہرستوں پر معارف کے پچھلے نمبروں میں تبصرہ کیا جا چکا ہے''۔ اس کے بعد اس کے مشمولات پر مفصل روشنی ڈالنے کے بعد لکھتے ہیں:

> ''اس فہرست کو ہمارے دوست مولانا حاجی معین الدین صاحب ندوی نے ترتیب دیا ہے اور مسودہ اور پروف کی بازخوانی مسٹر اے ہارن اور ڈاکٹر عظیم الدین نے کی ہے''۔

اس کے بعد لکھتے ہیں:

> ''حاجی صاحب ندوہ کے ایک مایہ ناز فرزند ہیں، انہوں نے دارالمصنفین میں بھی کچھ دنوں ہماری رفاقت کی ہے۔ معارف کی ابتدائی جلدوں میں ان کے متعدد مضامین نکلے ہیں، وہ ہمارے یہاں

سے ایشیاٹک سوسائیٹی بنگال کی فہرستیں ترتیب دینے کلکتہ گئے، چند سال وہاں یہ کام کرتے رہے، پھر اسی خدمت کے لئے بانکی پور کے کتب خانہ نے ان کو اپنے اسٹاف میں داخل کرلیا۔اس فہرست کی ترتیب میں ان کو جو کچھ محنت کرنی پڑی ہے اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ بہت سے نسخے جن کا اس فہرست میں تذکرہ ناتمام تھے، بعض پر نہ تو مصنف کا نام تھا نہ تصنیف کا، بعض پر غلط نام درج تھے، جلال الدین سیوطی کی ''بغیۃ الوعاۃ'' پر ''الفتح القریب اور مغنی اللبیب لکھا ملا، اسی طرح اور کتابوں پر بھی غلط اندراجات تھے، مولانا نے نہایت جانفشانی سے ہر کتاب کے متعلق نہ صرف اس کا اور اس کے مصنف کا نام معلوم کیا، بلکہ انہوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ یہ کتابیں کن زمانوں میں، کن حالات کے اندر، کن کن کتابوں کی مدد سے تیار ہوئیں۔جن جن کتابوں پر کسی عالم، بادشاہ، امیر یا قابل ذکر بزرگ کے دستخط ہیں انہوں نے ان سب کی شخصیتوں کو نمایاں کیا ہے۔اور ان ماخذوں کا حوالہ بھی دیا ہے جن سے ان بزرگوں کے حالات معلوم ہوسکتے ہیں۔ہر کتاب کے ذکر کے ساتھ وہ ان مقامات کا بھی پتہ دیتے ہیں جہاں جہاں ان کے اور نسخے پائے جاتے ہیں۔۔۔۔عام صورت ترتیب وہی ہے جو پچھلی فہرستوں کی ہے، لیکن پھر بھی انہوں نے جیسا کہ دیباچہ میں مسٹر جے اے جیب فرماتے ہیں، اس فہرست کی ترتیب میں انہوں نے اپنی مستثنیٰ قابلیت کا ثبوت دیا ہے۔ہر کتاب کا تذکرہ

ایک مختصر تبصرہ ہے جس میں اس کتاب کی تمام ندرتوں اور معنوی خوبیوں کی روح اتر آئی ہے۔

یہ فہرستیں انگریزی میں لکھی جارہی ہیں ،اور یہ جلد بھی انگریزی ہی زبان میں ہے،لیکن لوگوں کو یہ جان کر تعجب ہوگا کہ اس کا لکھنے والا وہ شخص ہے جو ایک دن بھی کسی انگریزی اسکول میں نہیں گیا،اس قسم کی کتابوں کی فہرست اور تلاش وتحقیق عموما یورپ کی مشرقی تعلیم کا نتیجہ سمجھا جاتا ہے ،مگر اس کے مؤلف نے دارالعلوم ندوہ اور دارالمصنفین کے سوا ایک قدم بھی باہر نہیں نکالا ،ایسی صورت میں اس کے تسلیم کرنے میں کیا عذر ہوسکتا ہے کہ قدیم تعلیم میں جدت کا ذرا رنگ پیدا کر دیا جائے تو

دیگراں نیز کنند آں چہ مسیحا می کرد

موصوف نے انگریزی خود دارالعلوم میں پڑھی ،اور اس کے بعد ذاتی مطالعہ اور مشق جاری رکھ کر اپنی لیاقت بڑھائی،اور اس قابل ہوئے کہ وہ بے تکلف علمی تاریخ پر اس زبان میں قلم اٹھا سکیں ، یہ بھی اتفاق ہے کہ ۱۳ برس کی خاموشی کے بعد ایک ہی سال میں ان کی دو کتابیں دو جگہ سے شائع ہوئیں،فہرست کتب خانہ گورنمنٹ پٹنہ سے اور خلفائے راشدین دارالمصنفین سے،اور بحمد اللہ کہ دونوں نے قبولیت حاصل کی۔ہم اس سعادت عظمیٰ پر اپنے دوست کو دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں‘‘(۱۶)

لیکن حیرت ہے کہ ان کے ان تمام کمالات کے باوجود ان کے وطن میں ان کا کوئی ذکر نہیں ملتا، حالانکہ حاجی صاحب وطن سے دور بھی نہیں تھے، راقم کی نظر سے وطن کی علمی انجمن الفلاح کا کارروائی رجسٹر بھی گذرا ہے جس میں اس زمانہ کے اہم اہل علم کا ذکر ہے، لیکن حاجی صاحب کا کوئی ذکر نہیں ملا، مدرسہ محمدیہ کے دستاویزات اور کاغذات میں بھی کہیں ان کا ذکر نہیں نظر آتا، نہ مولانا مبارک کریم کی رپورٹ میں نہ مولانا سید محمد ندویؒ کی تحریر کردہ مدرسہ کی تاریخ میں جس میں تقریبا اس وقت کے تمام اہل وطن کا تذکرہ ہے، اس میں تعزیتی نشستوں کا بھی ذکر ہے، اس ذیل میں بھی جہاں اقبال، مولانا سجاد اور وطن کے دیگر حضرات کا ذکر ہے ہمیں کہیں حاجی کی صاحب کی وفات پر کسی تعزیتی نشست کا ذکر نہیں ملتا، بہ ظاہر یہ بات بہت تعجب انگیز ہے اور اس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی، شاید ان کو گیلانی الاصل ہی سمجھا گیا پھر بھی کچھ نہ کچھ حق تو ضرور تھا۔

حواشی:

(۱) حیات سلیمان، طبع اول، ص ۱۰۱، حاشیہ میں شاہ صاحب نے حاجی صاحب کا اجمالی تعارف کرایا ہے، لکھتے ہیں ''حاجی معین الدین صاحب کا وطن استھاواں بہار تھا، ندوہ سے فراغت کے بعد ۱۹۱۴ء میں دارالمصنفین کے رفیق مقرر ہوئے، یہاں کے دوران قیام میں خلفائے راشدین اور مہاجرین جلد اول لکھی، پھر امپیریل لائبریری کلکتہ میں فہرست کی ترتیب پر مقرر ہوئے، یہاں سے خدا بخش لائبریری پٹنہ میں چلے گئے، اور عربی کتابوں کی فہرست کی کئی جلدیں انگریزی میں مرتب کیں جو چھپ چکی ہیں، کچھ دنوں دائرۃ المعارف

حیدرآباد میں رہے اور ہندوستان کے تاریخی مقامات کا ایک جغرافیہ عربی میں لکھا، آخر میں مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے پرنسپل مقرر ہوگئے تھے اور یہیں ۱۹۴۱ء میں وفات پائی''۔(۲) نور ہدیٰ از محفوظ الحسن شمسی مطبوعہ برقی مشین پٹنہ ۱۹۴۱ء (۳) مشاطہ گان ادب از عطاء اللہ پالوی مطبوعہ پٹنہ۔(۴) الندوہ لکھنؤ جولائی ۱۹۴۱ء (۵) ایضا (۶) ایضا (۷) ایضا (۸) مشاطہ گان ادب ، یادرفتگان ، نور ہدیٰ (۹) مشاطہ گان ادب (۱۰) مولوی خدابخش خاں، حیات اور کارنامے مطبوعہ خدابخش لائبریری پٹنہ ۲۰۰۱ء ،ص ۶۶ (۱۱) ایضاً (۱۲) مکاتیب گیلانی ،مرتبہ مولانا منت اللہ رحمانی، مطبوعہ مونگیر، ص ۱۴۳ و ۱۴۵ (۱۳) ایضاً، ص ۲۲۹ (۱۴) دیباچہ مصحح ،ص ۹ تاریخ اکبری معروف بہ تاریخ قندھاری مطبوعہ رضا لائبریری رامپور۔(۱۵) مشاطہ گان ادب، (۱۶) معارف فروری ۱۹۲۸ء

حاجی معین الدین ندوی کی تصانیف